غلام مصطفیٰ فاروق
اسکالر، پی ایچ۔ ڈی اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد
ڈاکٹر میمونہ سبحانی
استاد شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد

سر سید احمد خاں کے مکاتیب میں اخلاق و فلسفہ

Ghulam Mustafa
PhD Scholar, Department of Urdu, Govt. College University, Faisalabad.
Dr. Mamuna Subhani
Assistant Professor, Department of Urdu, Govt. College University, Faisalabad.

Moral values and Ethical Philosophies in The Letters of Sir Sayed Ahmad Khan

Sir Syed Ahmed Khan (1817-1898) was one of the eminent lovers of Urdu literature, constantly striving for the continuity and evaluation of the Urdu language throughout his life. One of the most important and substantive aspects of his writing is letter writing. He wrote a number of letters to his colleagues, politicians and academics. Although the chronicle of letter writing in Urdu began with Ghulam Ghos Bekhabar (1824-1905), nevertheless Sir Syed Ahmad Khan caused a stir in the static sea of letter writing in Urdu literature. Because British barbarism had a profound impact on society after the War of Independence of 1857, letters written in Hindi and Urdu at that time really reflected Indian society.

Key words: *Eminent, Urdu Literature, Letters, Moral Values, Philosophy, Collective, Struggle, Educational.*

سر سید احمد خان (۱۸۱۷-۱۸۹۸) کی ادبی، قومی، سیاسی اور مدبرانہ خدمات سے کوئی صاحب شعور ناواقف نہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کے لیے مسلسل جدوجہد کی اور اسی جدوجہد کا تسلسل پاکستان کی صورت میں نظر آتا ہے۔

وہ مسلمانوں کے ساتھی تھے اور انگریز جیسی سامراجی قوت کے ساتھ انھوں نے ہمیشہ علمی محاذ پر ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اسی لیے ان پر بہت سا تحقیقی و تنقیدی کام بھی ہوا اور کہیں انھیں نظر تحسین سے دیکھا گیا تو کہیں ان پر لعن طعن کی گئی۔ سر سید احمد خان کے خطوط کا غالب(۱۷۹۷-۱۸۶۹) کے خطوط سے موازنہ کیا جائے تو جو پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ سرسید کی کاوشات ساری قوم کے لیے تھیں اور یہی ان کی زندگی کا مقصد بھی تھا۔ البتہ مقصدیت کے تحت ان کے خطوط میں فلسفے کم اور اخلاقیات زیادہ دکھائی دیتی ہیں۔ جب کسی بھی شخص کے پاس ایک مقصد ہو اور اسی کے گرد اس کی زندگیکے دائرے وسعت اختیار کر رہے ہوں تو یہ مقصد ان کے قول و فعل دونوں پر حاوی نظر آتا ہے اور سرسید کے ساتھ بھی ایسا ہی ہے۔ سرسید احمد خانکے خطوط میں فلسفہ اخلاق بدرجہ اتم ملتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ قوم کے لیے مصلحت آمیز تحاریر تخلیق کر رہے تھے۔ مجموعی طور پر ان کی تمام تحاریر پر ہی ان کی مقصدیت، سادگی، خوش اخلاقی اور انسانیت دوست رویہ پروان چڑھا دکھائی دیتا ہے۔ عتیق احمد صدیقی کے مطابق ان کے خطوط میں اخلاقیات کی وجہ ان کا ظرف تھا جو انھیں مشکل سے مشکل موقع پر بھی ثابت قدم کھڑے رہنے کی تلقین کرتا تھا۔ لکھتے ہیں:

> ”سرسید کو اپنی درماندہ قوم سے بڑی محبت تھی اور ان کا کوئی لمحہ اس کی اصلاح و درستی کے خیال سے علیحدہ نہ تھا۔ ایک رہنما اور مجتہد کو بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ سرسید کو بھی برداشت کرنا پڑیں۔ سینکڑوں کا برا بھلا سنا، بہت سے مولویوں نے کفر کے فتوے دیے۔ ہزاروں نے ان پر طرح طرح کے اتہامات رکھے لیکن ان کی دلسوزی اور محبت قومی میں کبھی فرق نہیں آیا۔“(۱)

ان خطوط کی ادبی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان سے اردو پر انگریزی زبان کے اثرات، داستانوی کرداروں (مافوق الفطرت عناصر) سے آزادی بخشنے کے ڈانڈے بھی ان کی آسان فہم نثر سے جا ملتے ہیں۔ ان کے خطوط بھی ایک نئی دنیا ہے جس میں ایک ہی وقت میں زندگی کے مختلف ایک دوسرے میں مدغم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ سرسید کی سیاسی، اور ادبی زندگی کا تا حال برصغیر کی ادبی اور سیاسی زندگی پر گہرا اثر پایا جاتا ہے۔ انھوں نے مذہب کے حوالے سے جو نظریات پیش کیے وہ بھی کسی نہ کسی طرح یہاں ایک نئی سوچ کو جنم دینے میں کامیاب رہے۔ اگرچہ بہت سے ناقدین نے ان کے نظریات کو درست نہیں سمجھا لیکن ان کی اثر آفرینی سے کسی بھی طرح انکار نہیں کیا جاسکتا۔ سرسید احمد خان کے خطوط سے برصغیر کی اجتماعی زندگی کی متنوع رنگ تصاویر سامنے آتی ہیں۔ مسلمانوں کے

عروج وزوال کی داستان ایک جانب کے خطوط میں جھلکتی ہے تو دوسری جانب ان دونوں کی وجوہات کے مسائل سامنے آتے ہیں۔ سرسید کے خطوط کی ہمہ جہتی اور نیرنگی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> ”سرسید کے یہ خطوط انیسویں صدی کے سیاسی اور سماجی پس منظر کو نمایاں کرتے ہیں۔ اس کے آئینہ خانہ میں وہ تمام حالات و حادثات اور ان کے نشیب و فراز نظر آتے ہیں جن سے قوم دوچار ہوئی۔ یورپ کا قیام، تہذیب الاخلاق، انسٹی ٹیوٹ گزٹ، محمڈن ایجوکیشنل کانفریس، سائنٹفک سوسائٹی وغیرہ کے منصوبے کن کن مراحل و منازل سے گزرے، جاں فشانی اور صبر آزما لمحات کا سامنا کرنا پڑا، یہ سب تفصیل ان خطوط میں موجود ہے۔“(۲)

سرسید احمد خان (۱۸۱۷-۱۸۹۸) کے مکتوبات میں قوم پرستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی دکھتی ہے۔ بالخصوص ان کے قیامِ یورپ کے دوران مسلمانوں کی رہنما محسن الملک (۱۸۳۷-۱۹۰۷) کے نام خطوط میں بڑی تعداد میں ایسے خطوط موجود ہیں جن میں وہ قوم سے دور رہتے ہوئے بھی کہیں اس کی فلاح کے لیے سفارشات بھیجتے ہیں، کہیں نصیحت کرتے ہیں، کہیں اس کے لیے ہر ممکن مدد کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے ایک خط کا نمونہ ملاحظہ کیجیے جس میں وہ یورپ میں سفر کے دوران نواب محسن الملک کو تحریر کرتے ہیں کہ یورپ کی اجتماعی اخلاقیات کیسی ہیں۔اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

> ”جس اخلاق سے یہاں کے امرا اور اراکین ملے ہیں اس کا بیان، بیان سے باہر ہے۔ کچھ میرے ہی ساتھ یہ اخلاق نہیں ہے بلکہ حقیقت میں وہ لوگ با اخلاق اور سادہ مزاج اور بے غرور ہیں۔ میں ہر دم اپنے ملک کی بھلائی کے خیال میں ہوں اور عنقریب کچھ کچھ انشا اللہ تعالیٰ مشتہر کرنا شروع کرتا ہوں۔ وزیر ہند میرے آنے کے دو تین روز بعد باہر چلے گئے ہیں۔ اول ان سے ملاقات خاص ہو لے تب کچھ تحریک بہتریٔ ہندوستان شروع ہو گی۔ (۳)

اس خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ولیم میور (۱۸۱۹-۱۹۰۵) نے جو حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس کے حوالے سے جو گستاخانہ کتاب تحریر کی ہے وہ اس کا بھرپور جواب تحریر کر رہے ہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ اس کو شائع کرنے کے لیے ان کے پاس مناسب انتظام نہیں ہے۔ اسی لیے اس کتاب کی اشاعت کے لیے چندہ اکٹھا کیا جائے تاکہ

ولیم میور کو منہ توڑ جواب دیا جاسکے۔ ان کے اس خط میں عشقِ رسول ﷺ کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے اور قوم کے جذبات کی اخلاقی ترجمانی بھی۔ وہ توڑ پھوڑ اور شدت سے لڑائی جھگڑے کے خلاف تھے اور عقل مندانہ طریقے سے ایک تکلیف دہ صورتِ حال کا جواب دینا چاہتے تھے البتہ اس میں وہ ان لوگوں کے حوالے سے بد دل بھی دکھائی دیتے ہیں جو ان کے اس نیک کام میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ اس حوالے سے تحریر کرتے ہیں کہ:

> "مجھ کو نہایت افسوس ہے کہ بعض احباب نالائق مثل مولوی نے میرا ارادہ دربار تحریر جواباً کتاب میور صاحب جو نسبت آں حضرت صلعم لکھی ہے سست کر دیا اور بروقت روانگی سامان اور چندہ کرنے نہیں دیا۔ یہاں اس کا جواب اس قدر سامان کیا ہے کہ بیان نہیں ہو سکتا۔"(۴)

سر سید احمد خان (۱۸۱۷-۱۸۹۸) کے مکتوبات کے حوالے سے صغیر افراہیم مکتوباتِ سر سید کے معروضی تجزیے کے بیان میں تحریر کرتے ہیں کہ نہ صرف یہ ان کا حالِ دل بیان کرتے ہیں بلکہ اپنے عہد سے روشناس بھی کراتے ہیں اور بغیر کسی قافیہ پیمائی کے علم کے اظہار کا ذریعہ بھی بن جاتے ہیں۔ کسی بھی عبقری شخصیت کی مدبرانہ اور قائدانہ صلاحیتوں کے تجزیہ و تفہیم میں اس کے مکاتیب کا مطالعہ کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ مکتوب محض اطلاعات و خبروں کا مجموعہ ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے توسط سے مکتوب نگار کی علمی و فکری بلوغت، ذہنی کیفیت، قوم و ملت کے تئیں احساسات و جذبات، بزرگوں سے عقیدت، چھوٹوں سے شفقت و محبت کے علاوہ اس عہد کی تاریخ، تہذیب و تمدن اور ثقافت سے کماحقہ واقفیت بھی ہو جاتی ہے۔ سر سید احمد خانکے خطوط میں بھی ان کی قوم کے لیے فکر، ان کا تدبر اور ان کی دور نظری کی سبھی مثالیں ملتی ہیں۔ غالب (۱۷۹۷-۱۸۶۹) کے خطوط کا عکس سر سید کی تحریر میں بھی جا بجا ملتا ہے۔ محسن الملک (۱۸۳۷-۱۹۰۷) کے نام خط کا یہ حصہ ملاحظہ کیجیے جس میں وہ ان کے خط پا کر اتنا مسرور نظر آتے ہیں کہ یہ محسوس ہی نہیں ہو پاتا کہ وہ اتنے بڑے مصلح اور لیڈر رہے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> "اے وقت تو خوش کہ وقت ماخوش کردی" جس قدر دل کو مسرت آپ کے خط سے ہوئی ہے بیان نہیں کر سکتا۔ اگر یوسف زلیخا کو یا لیلیٰ مجنوں کو ملتی تو شاید اس قدر خوشی ہوتی، جس محبت سے لکھا تھا وہ اثر ان لفظوں میں موجود تھا اور آنکھ سے برابر دل میں پہنچتا تھا۔ جس محبت سے آپ نے اشعار لکھے تھے ان کو پڑھ کر میں ایسا محو محبت ہوا کہ

گویا یہ سمجھنا دشوار تھا کہ وہ شعر میں نے آپ کے حق میں لکھے ہیں اور اس کیفیت سے وحدت وجود کے مسئلے کا عقدہ حل ہوتا تھا۔"(۵)

سر سید احمد خان(۱۸۱۷-۱۸۹۸) کی کل اخلاقیات ان کی قوم کی فلاح و بہبود سے جڑی نظر آتی ہیں۔ وہ دنیا کے کسی بھی خطے میں رہے، ان کے اندر کا مسلمان ہمیشہ جاگتا رہا۔ وہ یورپ قیام کے دوران انگریزوں سے مسلمانوں کے لیے بہت کچھ طلب کرتے رہے۔ سر سید اس حوالے سے بہت نڈر اور حوصلہ مند ثابت ہوئے کہ وہ انگریز کے سامنے کلمہ حق کہتے رہے حالاں کہ وہاں وہ مکمل طور پر اسی کے رحم و کرم پر تھے۔ انگریز نے برصغیر میں جیسا غل مچایا تھا اور جس طرح قتل عام کیا تھا، ایک سر سید ان کے لیے کوئی بڑا مسئلہ نہ تھا لیکن سر سید اپنی پر زور شخصیت کے ساتھ ان سے حق بات کہتے رہے اور اس پر ڈٹے بھی رہے۔ ان کے خط کا یہ حصہ ملاحظہ کیجیے جس میں وہ انگریز سے یہ حق مانگتے نظر آتے ہیں کہ ہندوستان کے افسروں کو جو یورپ آنا چاہیں، رخصت کے وقت پوری تنخواہ دی جائے یا تنخواہ سے محروم نہ کیا جائے۔ محسن الملک(۱۸۳۷-۱۹۰۷) کو تحریر کرتے ہیں کہ:

> "میں نے یہاں بڑی غل مچائی ہے کہ ہندوستانی افسروں کو جو ولایت آنا چاہیں ان کو رخصت پوری تنخواہ پر ملنی چاہیے۔ اکثر ممبران انڈیا کونسل گان بھی میری فریاد پر رکھتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنی درخواست پیش کی ہے۔ نقال اس کی آپ کو ملاحظہ کو روانہ کرتا ہوں اگر یہ ہو گیا تو بلاشبہ آپ کو رخصت پوری تنخواہ پر مل سکے گی۔ اب اس وقت ڈاک کا وقت تنگ ہوتا ہے آئندہ ڈاک میں اور حال لکھوں گا۔"(۶)

حق بات کو حق تسلیم کرنا اور اس میں اپنے پرائے کی ذات کی فکر نہ کرنا یا بیچ میں نہ لانا عین اخلاقیات ہے۔ انھیں ایک انگریز مورخ کی کتاب پسند آئی جس میں مسلمانوں کی صحیح تاریخ کی تلاش اور مسلمانوں تک اس کو پہنچانے اور بیان کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کے حوالے سے انھوں نے پہلے بھی ذکر کیا تھا کہ اگرچہ وہ غیر مسلم ہے لیکن اس نے تحقیق کے ضابطے پورے کرتے ہوئے بہترین انداز میں کتاب تحریر کی ہے اور انصاف کے اصولوں کو کہیں بھی نظر انداز نہیں کیا۔

> "گو بعض خیالات اس کے تمھارے خیالات کے مطابق نہ ہوں وہ مسلمان نہیں ہے انگریز ہے۔ جب آپ اس کی کتاب دیکھیں گے تو جانیں گے کہ وہ انگریز ہزاروں مسلمانوں سے بہتر ہے۔"(۷)

اسی خط میں لکھتے ہیں کہ انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں اور مسلمان حکومتوں کی تاریخ مرتب کرتے ہوئے ناانصافی اور تعصب سے لکھی ہیں۔ اس لیے ایسے دور میں کسی انگریز ہی کے ہاتھ سے لکھی گئی انصاف پر مبنی تاریخ جس میں سچائی کا دامن تھامنے کی پوری کوشش کی گئی ہو، بہت بڑی نعمت ہے۔ سرسید کا علم اور اس کا صحیح سمت میں استعمال بھی ان کے فلسفہ اخلاق سے جڑا ہے۔ ان کے ہاں غالب (۱۷۹۷-۱۸۶۹) کی نسبت زیادہ اجتماعیت ہے۔ مثلاً وہ اسی خط میں اندلس میں مسلمانوں کے حملے اور صلیبی جنگوں کے بارے میں حق گوئی کی تعریف کرتے ہیں ۔ یہاں سرسید کا فلسفہ اخلاق شخصیات انفرادی نہیں رہتا بلکہ مسلمانوں کے اجتماعی مسائل اور تاریخ سے جڑ جاتا ہے۔ یہیں تک نہیں، سرسید کا اس سلسلے میں فاضل مصنف سے باقاعدہ ملنا اور ان موضوعات پر گفتگو کرنا بھی اس خط سے معلوم ہو ہوتا ہے۔ آخر میں وہ ان سے ان کتب کی خریداری کے سلسلے میں چندہ جمع کرنے کو کہتے ہیں تاکہ قوم تک صحیح معنی میں مسلمانوں کی تاریخ پہنچے اور وہ اپنی قوم پر فخر کر سکیں۔

سرسید ایک روشن خیال انسان تھے۔ ان کے ہاں ایسے بہت سے معاملات جہاں دیگر مسالک میں پابندیاں تھیں، وہ آزادی محسوس کرتے تھے اور اس کا بیان بھی کرتے تھے جو کہ اگلے خطوط میں پیش کیا جائے گا لیکن اس سب کے باوجود وہ کبھی بھی خلافِ انصاف بات سننے پر راضی نہ ہوتے تھے اور وہی کہتے تھے جو ان کے نزدیک درست ہو۔ درج بالا خط ہی کی طرح ایک اور خط میں وہ ایک انگریز مصنف مسٹر ڈیون پوٹ کی تعریف محض اسی لیے کرتے ہیں کہ وہ اس نے حضور ﷺ کے حوالے سے جو حقیقت، انصاف اور سچ تھا، وہی بیان کیا ہے۔ ایسے وقت میں جب کہ ولیم میور (۱۸۱۹-۱۹۰۵) جیسے لوگ اسلام اور حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس کے حوالے سے زہر افشانی کر رہے تھے، جان ڈیون پوٹ کا انصاف پر مبنی مقالہ مسلمانوں کے لیے طمانیت کا باعث تھا۔ سرسید حق اور سچ کے ساتھ کس طرح کھڑے اس مصنف کی تعریف کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ:

> "ایک انگریز جس کا نام مسٹر جان ڈیون پوٹ ہے حمایت مذہب اسلام میں ایک عجیب و غریب کتاب لکھی ہے۔ جناب پیغمبر خدا ﷺ کا حال لکھا ہے اور جس قدر اتہام و الزام انگریزوں نے آنحضرت ﷺ پر اور قرآن پر اور مذہب اسلام پر لگائے ہیں اس کا جواب دیا ہے۔ چوں کہ یہ کتاب بالکل انگریزوں کے مخالف تھی اس کا چھاپہ ہونا اور فروخت ہونا مشکل تھا۔ میں نے کل لاگت چھاپہ کی دینی قبول کی اور احباب سے اس کیلاگت ادا کرنے کے کو طلب کیے تھے۔ پس اگر وہ خط نہ پہنچا ہو تو آپ فی الفور بھیج دو۔

وہ کتاب تیار ہو گئی، چھپ چکی۔ آیندہ میل میں روانہ کروں گا۔ تصویر مسٹر ڈیون پوٹ کی بھیجتا ہوں۔ نہایت تعظیم و ادب اور محبت رکھنے کے لائق آدمی ہیں۔"(۸)

ایک طرف جان ڈیون پوٹ کی کتاب سر سید کے لیے باعث طمانیت تھی دوسری جانب ولیم میور (۱۸۱۹-۱۹۰۵) کی جانب سے سر سید کا دل سوزِ نہانی سے چور تھا کہ وہ نہایت نا انصافی اور تعصب سے اسلام کے حقائق کو مسخ کرنے کی کوشش میں مبتلا تھا۔ سر سید اس حوالے سے تحریر کرتے ہیں کہ چوں کہ یہ ادبی اخلاقیات کے بھی خلاف ہے اور انصاف کے خلاف بھی اس لیے وہ دلی آزار میں مبتلا ہیں۔ اس میں اس حوالے سے اتنے زیادہ جذباتی دکھائی دیتے ہیں کہ جوابی کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں اپنے وقت کے علما سے ایک قدم آگے دکھائی دیتے ہیں کہ وہ ہی محض ایسے عالم تھے جو دیگر لوگوں سے زیادہ انگریزی جانتے تھے، انگریز کی آنکھوں میں آنکھ ڈالنے کا جذبہ رکھتے تھے اور منطقی طور پر اینٹ کا جواب پتھر سے دینا جانتے تھے بلکہ یورپ میں قیام پذیر بھی تھے۔ حق گوئی اور انصاف کے لیے ان کی اخلاقی جذباتیت کا نمونہ ملاحظہ کیجیے:

"ان دونوں میں ذراہ میرے دل کو سوز ہے۔ ولیم مور صاحب نے جو کتاب آں حضرت ﷺ کے حال میں لکھی ہے اس کو میں دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل کو جلا دیا اور ان کی نا انصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا اور مصمم ارادہ کیا کہ آں حضرت ﷺ کی شا نمیں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے قیامت میں یہ کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد ﷺ کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا، حاضر کرو۔ "مارا ہمیں تمغہ شاہنشاہی بس است" میں نے فرانس اور جرمن سے اور مصر سے کتب سیر منگانی شروع کر دیں۔ چٹھیات روانہ ہو گئیں۔"(۹)

سر سید احمد خان کی فراخدلی کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ کہ آپ جب بھی کوئی کام دیکھتے تو اس کی تعریف کرتے اور اس کو داد بھی دیتے۔ جہاں تک کہ آپ نے ہومیو پیتھک سوسائٹی کو خط لکھ کر ان کے طریقہ علاج پر مبارک باد دی۔ ایک خط بنام جے۔ ایچ۔ بی۔ آئرن سائیڈ سی۔ بی کو ہومیو پیتھی طریقہ علاج سے شفایاب ہونے پر خط لکھا اور ہومیو پیتھی طریقہ علاج کو پسند کیا اور تعریف کی۔ لکھتے ہیں:

"اگرچہ ایسی طرز سے پہلے بھی اس شہر میں معالجہ ہوتا تھا مگر تاہم پہلے اس کو سب لوگ انوکھا اور عجیب سمجھتے تھے اور بہت لوگ یہ بات دریافت کرنا چاہتے تھے کہ ایسے سخت مرض، اس قدر آسان اور نرم دواؤں سے کیونکر رفع ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ بہت سارے لوگ اب اس شفاخانہ میں بھی دریافت کرنے کی غرض سے آتے ہیں۔ اور بہت لوگ اس سے آگاہ بھی ہوگئے اور اب پسند کرنے لگے ہیں۔"(۱۰)

سرسید احمد خان(۱۸۱۷-۱۸۹۸) کے خطوط میں مسلمانوں کے لیے نہ صرف فلسفہ اخلاق موجود ہے بلکہ ان کی ذلت و خواری کے اسباب، ان کے غیر اخلاقی رسوم و رواج اور زوال پذیر تہذیب کے نشانات بھی بہت واضح ہیں۔ سرسید احمد خاننے بڑی مشاقی سے ان سب غیر اخلاقی مسائل و اسباب کا ذکر کیا ہے جن کی وجہ سے مسلمان پریشانی اور ذلت و خواری کا شکار ہو رہے تھے۔ ان کے خطوط میں انگریز کے مسلمانوں کو برا سمجھنے کے اسباب بھی واضح ہیں اور انگریز سے مختلف میدانوں میں پیچھے رہ جانے کی وجوہات بھی اہمیت کی حامل ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"یورپ دیکھ کر یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ کونسی رسمیں اور عادتیں ہندوستان کی ۔ اور خصوص مسلمانوں کی اچھی ہیں اور کونسی خراب اور قابلِ تبدیل ہیں ۔ اصول ایمانیہ اسلامیہ پر جس قدر یقینیورپ کے آنے سے اور یہاں کے حالات اور علوم اور یہاں کے علما کی رائیں دریافت کرنے سے ہوتا ہے بلا تشبیہ نعوذ باللہ ویسایقین حج سے نہیں ہوتا۔ زیادہ تعجب یہ دیکھ کر ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے صرف نج سے اور آپس میں ہو رہاہے۔"(۱۱)

مثبت انداز میں قوم پرستی ہی کے حوالے سے سرسید کے خطوط کی کافی تعداد موجود ہے۔ سرسید کو اپنی قوم کے ڈوبتے بیڑے سے محبت اور ہمدردی تھی۔ وہ کسی بھی قیمت پر اس کی اخلاقی اقدار کو بہتری کی جانب گامزن کرنا چاہتے تھے، انھیں ڈوبنے سے بچانا چاہتے تھے اور اس سارے عمل میں خالص خلوص ان کا رہنما تھا۔اسی لیے وہ اس سلسلے میں اپنی قوم کا موازنہ یورپ سے بھی کرتے تھے تاکہ دونوں قسم کے حالات سے آگاہی ہو سکے اور بہتری کی کوئی صورت نکلے۔ اسی سبب بہت سے لوگوں نے انھیں انگریز کا ایجنٹ تک کہا لیکن وہ اپنی قوم کی اصلاح سے باز نہ آئے۔ نواب محسن الملک(۱۸۳۷-۱۹۰۷) کو ایک خط میں لکھتے۔ ملاحظہ کیجیے:

”پس حال و نتیجہ سفر یورپ کا یہ ہے مگر ہماری قسمت میں وہی جلنا ہے۔ یہاں کا حال دیکھ دیکھ کر اپنے ملک اور اپنی قوم کی حمایت اور بیجا تعصب اور تنزل موجودہ اور ذلت آیندہ کے خیال سے رنج و غم زیادہ بڑھ گیا ہے اور کوئی تدبیر اپنے ہم وطنوں کے ہوشیار کرنے کی نہیں معلوم ہوتی۔ مذہب جس کو سمجھتے ہیں کہ ہم نے خوب اختیار کیا ہے اس میں بھی وہ حماقت اور نالائقی اور گمراہی ہے جو اور تمام کاموں میں ہے۔ پس کوئی کیا کرے۔ بد اقبالی و بد نصیبی کا کچھ علاج نہیں۔“(۱۲)

کسی کی ذات اور کام پر تنقید دنیا کا آسان ترین کام ہے اور اس کے برعکس اپنی ذات کا سدھار اور ہر عیب سے پاک کرنے کی کوشش مشکل ترین کام۔ کوئی بھی انسان یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ زندگی میں کوئی غلطی یا بھول چوک نہ کرے۔ عمومی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کچھ نہ کچھ غلط سرزد ہو جاتا ہے اور مشکلات پیش آتی ہیں۔ سر سید احمد خان(۱۸۱۷-۱۸۹۸) کے خطوط میں ان کی ذات پر کفر و الحاد کے حوالے سے لگنے والے الزامات اور انگریز کا ساتھی ہونے کے الزامات کے بارے گہرا دکھ پایا جاتا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو ایک دوسرے کی عیب جوئی کے بجائے ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے اور جہاں عملی اقدامات کی ضرورت ہو وہاں عملی اقدامات بھی کرنے چاہیں۔ محض قول کے مسلمان ہونے سے بہتر ہے کہ فعل کے مسلمان بھی ہوں۔ ان کے نزدیک حقیقی اخلاقیات یہ ہے کہ جو کام شروع کیا جائے اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا جائے چاہے اس میں جان جائے۔ اسی لئے ناسازی طبیعت کے باوجود سر ولیم میور(۱۸۱۹-۱۹۰۵) کی کتاب کا جواب لکھنے کی کوشش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

”میں روز و شب تحریر کتاب سیر مصطفوی ﷺ میں مصروف ہوں، سب کام چھوڑ دیا ہے۔ لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے۔ ادھر فکر ترتیب مضامین کتاب ادھر فکر جواب اعتراضات۔ ادھر فکر تنقیع و تصحیح روایات صحیح میں مبتلا رہتا ہوں اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور بخت ہو گیا ہے۔ ادھر جب حساب دیکھتا ہوں تو جان نکل جاتی ہے کہ ابھی لکھوانا اور چھپوانا تو شروع کر دیا روپیہ کہاں سے آئے گا۔ مسلمان البتہ آستین چڑھا کر اس باب میں تو لڑنے کو تیار ہوں گے کہ انگریزوں کے ساتھ کھانا مت کھاؤ مگر جب کہو کہ مذہبی تائید میں کچھ روپیہ خرچ کرو تو جان بچاویں گے۔“(۱۳)

سر سید احمد خان(۱۸۱۷-۱۸۹۸) کو اپنے بے مثال خدمات کی وجہ سے یورپ سے "اسٹار آف انڈیا" کا اعزاز ملنے پر خوش ہونے کے بجائے اپنا اصل اعزاز مسلمانوں کی بطور قوم خدمت کو گردانا اور اسی فکر میں مبتلا بھی رہے۔یوں ان کی اخلاقیات کو قوم کی ترقی اور اس سے محبت کا مرہونِ منت کہا جاسکتا ہے. سر سید احمد خان کی انسانیت سے ہمدردی بھی ہر جگہ نمایاں رہی۔ آپ نے ہمیشہ مذہب سے بالاتر ہو کر انسانوں کی خدمت کو ترجیح دی۔ آپ نے رنگ نسل اور مذہب کو مدنظر رکھے بغیر خدمت کی۔ سید ابوالحسنات نے میر نجابت علی کی کتاب کا اردو ترجمہ کیا اور اس میں سر سید احمد خاں کی اجتماعیت اور آفاقیت کی سوچ کو دکھایا ہے۔

"۱۸۶۰ء میں مرادآباد میں ایک بہت بڑا قحط پڑا تھا۔ اس کا امدادی کام سر سید کے سپرد کیا گیا۔ انہوں نے تمام مصیبت زدوں جن میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی دیکھ بھال اتنی اچھی طرح کی کہ ایک معزز ہندو راجہ جے۔ کشن داس سی۔ ایس۔ آئی سر سید کی تندہی دیکھ کر زندگی بھر کے لئے ان کے دوست اور معترف ہو گئے۔" (۱۴)

سر سید احمد خان(۱۸۱۷-۱۸۹۸)یورپ میں قیام پذیر تھے، بر صغیر میں انگریز کے ہاں ملازمت کرتے رہے تھے لیکن اس سب کے باوجود وہ انگریز سے بے خوف تھے۔ عمومی طور پر یہ ہوتا ہے کہ انسان جہاں ملازمت کرتا ہے، وہاں احکامات بھی مانتا ہے اور جائز و ناجائز ہر ضرورت بھی پوری کرتا ہے لیکن سر سید کے ہاں ایسا نہیں تھا۔ اگر ولیم میور(۱۸۱۹-۱۹۰۵) جو کہ خود بھی بر طانوی حکومت کا ملازم اور نمائندہ تھا، اس نے حق و انصاف کے اصولوں کے خلاف تحریر کیا تو فوری طور پر انھوں نے اس کا جواب تحریر کیا۔ یہ جواب خطباتِ احمدیہ کے عنوان کے تحت تحریر کیا گیا تھا۔ محسن الملک(۱۸۳۷-۱۹۰۷) کو تحریر کیے گئے خط سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ولیم مور کو جواب اور دیگر انگریزوں سے اس کتاب کو چھپانا چاہتے ہیں لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس سے کسی قسم کے خوف میں مبتلا ہوں۔ کیوں کہ اس کے فوراًبعد یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ جب ایک بار کتاب مکمل ہو گئی تو وہ اپنے ہاتھ سے ولیم مور کو پیش کریں گے لیکن اس سے قبل یہ عمل چھپانا محض حکمتِ عملی کے تحت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ کتاب کی اشاعت میں چوں کہ روپے کا مسئلہ آڑے آرہا ہے اس لیے بے شک کسی مہاجن سے روپیہ لے کر بھیجیں چاہے یہ رقم مہاجن سے ادھار کیوں نہ لی گئی ہو لیکن اس کتاب کا چھپنا سب سے زیادہ اہم امر ہے۔ اس کے لیے چاہے ان کا ذاتی سامان تک بیچنا پڑے، بیچ دیا جائے۔ لکھتے ہیں:

”اغیار سے اس کو مخفی رکھنا چاہیے کیوں کہ میں نہیں چاہتا کہ قبل از تمام کتاب جناب سر ولیم میور صاحب کو اس کا حال معلوم ہو۔ بعد از تمام انشا اللہ تعالیٰ میں خود اپنے ہاتھ سے نذر دوں گا۔ اب بجز روپیہ کے اور کسی چیز کی فکر نہیں میں چاہتا ہوں کہ آپ اس خط کے پہنچنے کے بعد میر ظہور حسین کے پاس جائیے اور میری یہ درخواست ہے کہ وہ دونوں صاحب مل کر کسی مہاجن سے میری لیے ہزار روپیہ قرض لیجیے۔ سود اور روپیہ میں ادا کروں گا مگر چوں کہ میں یہاں ہوں اس لیے کچھ بندوبست نہیں کر سکتا۔ ہزار روپیہ بھیجنے کے لیے دلی لکھا ہے اور میں نے لکھا ہے کہ کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرے ظروف مسی تک فروخت کر کے ہزار روپیہ بھیج دو۔“(۱۵)

ولیم میور (۱۸۱۹-۱۹۰۵) کی کتاب ”The life of Muhammad“ (1861) کے جواب میں تحریر کی گئی ”خطباتِ احمدیہ“ (۱۸۷۰) کے بارے میں بات کریں تو اس کتاب کے ابواب کا ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بارہ خطبات پر مشتمل تھا جن میں سے اول جغرافیہ عرب کا، مختلف تاریخ عرب سے جس میں کمال تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ فاران مکہ کے پہاڑ ہیں جہاں سے حضرت محمد ﷺ کے نبی ہونے کی بشارت توریت میں دی گئی تھی۔ دوسرا خطبہ عرب کے رسوم و رواج، عربوں کی زمانہ جاہلیت میں جس میں دکھایا گیا ہے کہ اسلام نے کس قدر ان کو آراستہ کیا۔ تیسرے خطبے میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ عرب میں کس قدر مذہب قبل اسلام کے موجود اور جاری تھے اور ان میں سے اسلام کس سے مناسبت رکھتا ہے۔ اسی ضمن میں اسلام کا بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہونا ثابت ہے یا صرف ایک بنایا ہوا مذہب، اس کی بحث موجود ہے۔ خطبہ چہارم میں یہودی اور عیسائی مذہب کو اسلام سے فائدہ ہوا یا نقصان، اس سے بحث کرتا ہے۔ خطبہ پنجم میں اسلام کی حالت و کیفیت، خطبہ ششم میں مذہبی روایات اور ان کے اعتبار اور عدم اعتبار کا حال موجود ہے۔ خطبہ ہفتم میں قرآن مجید سے متعلق ہے جس میں کئی عمدہ مباحث کو شامل کیا گیا ہے۔ خطبہ ہشتم میں تاریخ مکہ و تاریخ آباؤ اجداد حضرت محمد ﷺ کا ذکر کیا گیا ہے۔ خطبہ نہم میں حضرت محمد ﷺ کا نسب نامہ اور ان سے متعلق تمام مباحث موجود ہیں۔ خطبہ دہم میں حضرت محمد ﷺ کا توریت اور انجیل میں ذکر کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔ خطبہ یازدہم میں شق صدر و معراج کے حقائق سے بحث ہے اور خطبہ دوازدہم میں حضور ﷺ کی پیدائش سے بارہ سال کی عمر تک کے حالات و واقعات پر تفصیلاً روشنی ڈالی گئی ہے۔ ص:۶۸۔ اس کتاب کی اشاعت اور

تیاری میں انھیں جس قدر مشکلات پیش آئیں اور جس طرح وہ دل جمعی سے اس کی تکمیل پر کمر بستہ رہے، اس کے حوالے سے ان کے خط کا یہ پیرا گراف ملاحظہ کیجیے:

”میں اپنا حال آپ کو کیا لکھوں۔ سکتہ کا سا حال ہو گیا ہے۔ دن رات کی محنت و مشقت اور اس طرح طرح کی تکلیف سے میرا دل ہی خوب جنتا ہے۔ جلد اول خطبات الاحمدیہ کی تصنیف تمام ہوئی اور اس مہینے چھاپہ بھی تمام ہو جاوے گا۔ اب جو اندازہ اس کی یعنی ایک جلد کے چھاپہ کی لاگت کا کیا گیا تو ڈھائی ہزار روپیہ سے زیادہ کا معلوم ہوتا ہے۔ ہوش جاتے رہے اور جان میں جان نہیں رہی۔ میر تراب علی نے نہایت مدد کی ہے۔ تین سو روپیہ اس کے چندہ کی بابت بھیجا ہے۔“(۱۶)

ذاتی استعمال سے زاید اشیا کو خرچ کرنا یا دے دینا ایثار ہے جب کہ اپنے حصے کی خوشیاں، سامان یا حقوق کو دے دینا قربانی کہلاتی ہے۔ سر سید احمد خان(۱۸۱۷-۱۸۹۸) قربانی دینے والوں میں سے تھے۔ ان کے ساتھ یہ المیہ ساری زندگی رہا کہ ان کے خلوص کو تنگ نظری، تعصب اور شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا۔ ایسا کرنے والوں میں سے ایک نام مولوی س۔خ کا تھا۔ س۔خ تحریر کرکے راس مسعود(۱۸۸۹۔۱۹۳۷) نے اصل نام چھپا دیا ہے تا کہ خطوط کی وجہ سے کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ اس سلسلے میں انھوں نے اہم خدمت سر انجام دی ہے۔ مولوی س-خ کی الزام تراشی اور پہنچائی گئی تکالیف کے باوجود بھی سر سید مہر و محبت کے خوگر نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

”اب آپ کو میری طبیعت کا حال خوب معلوم ہو گیا ہے۔ میں رشتے ناطے کی سچی محبت اور دوستی کے آگے کچھ بھی حقیقت نہیں سمجھتا۔ مولوی س۔خ کو میں اپنے چھوٹے بھائی سے کم نہیں سمجھتا اور اب بھی بہ لحاظ ان کی صحت و تندرستی و خوشی و آرام و دینی و دنیوی عیش کے ایسا ہی سمجھتا ہوں اور ایسا ہی جانتا ہوں۔ آپ یقین جانیے کہ جس قدر مجھ کو اپنے بھائی کے مرنے کا رنج ہوا تھا اسی قدر یا اس کے قریب مولوی ---صاحب کی طرف جو میرے دل میں رنج و ملال آیا ہے اس کو مجھ کو رنج ہوا ہے۔ وہ بچے ہیں انھوں نے دنیا نہیں دیکھی، دوستی و محبت کے معاملات و برتاؤ سے محض ناواقف ہیں۔“(۱۷)

سر سید احمد خان(۱۸۱۷-۱۸۹۸) کے خطوط میں فلسفہ دوستی اور محبت بھی ملتا ہے۔ دوستی در حقیقت احترامِ انسانیت ہی کا حصہ ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ دوست وہ ہے جو دوسروں کے وقت پر کام آئے لیکن ایک طرح سے

یہ بھی غرض کا رشتہ جن جاتا ہے۔ دوستی کا اصل رشتہ خلوص و محبت اور پاکیزگی پر مشتمل ہے۔ جب نواب محسن الملک (۱۸۳۷-۱۹۰۷) کو سر سید احمد خان کی بابت معلوم ہوا کہ وہ کسی دوست سے ناراض ہیں تو انھوں نے اس کا استفسار سر سید احمد خان سے کیا۔ اس پر سر سید احمد خان نے پہلے تو دوستی کے حوالے سے اپنا یہ موقف بیان کیا کہ ان کے نزدیک ایسا سوچنا بھی کفر ہے پھر مزید وضاحت کی کہ دوستی پتھر سے زیادہ مضبوط رشتہ ہے لیکن یہ بال سے زیادہ باریک اور نازک بھی ہے۔ اصل معاملے کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ:

> ”میں تو اس شخص کو کافرِ بے ایمان سمجھتا ہوں جو دوست کی نسبت یہ خیال کرے کہ اس کے خلاف دوستی و محبت کے کوئی بات کی یا کہی۔ میں تو دوست کے گالی دینے اور برا کہنے کو بھی دوستی پر حملہ کرتا ہوں اور در حقیقت دوستی ہی کے سبب سے وہ بات ہوتی ہے مگر جب حقیقت میں خلاف محبت و دوستی کے اور کوئی بات ہو تو پھر شیشہ محبت جو نہایت نازک ہے کسی طرح ثابت نہیں رہ سکتا۔ آپ خیال کیجیے کہ محبت اور دوستی ایسی سخت اور مضبوط چیز ہے کہ کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتی اور کوئی اس کو نہیں توڑ سکتا مگر ہو نازک بھی ایسی ہے کہ باریک سے باریک شیشہ اور حباب کو بھی اس سے نسبت نہیں۔“[۱۸]

تصوف کے فلسفوں میں ”حقیقت“ ایک ایسا فلسفہ ہے جس کی خاطر صوفی پوری زندگی گزارتا ہے۔ وہ حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے اور کبھی ملامتی رنگ اپناتا ہے، کبھی مزاحمتی رنگ اپناتا ہے اور کبھی کچھ اور لیکن اس کے باوجود کوئی حقیقت تک پہنچ پاتا ہے اور کوئی نہیں۔ سر سید نے اس حوالے سے نیا رنگ اپنایا تھا۔ سر سید احمد خان (۱۸۱۷-۱۸۹۸) ایسے احباب سے جنھیں عرفِ عام میں مولوی یا روایتی مولوی کہا جاتا ہے، ناگواری کا اظہار بھی کیا ہے۔ اس ناگواری میں وہ فلسفہ عبادت پر پروشنی ڈالتے ہیں کہ کسی سے اپنے زہد و تقویٰ کے سبب خوامخواہ ناراضی کا اظہار کرنا، خود کو بڑا ثابت کرنا یا ان کے تعلق داروں سے منھ موڑنا یا کسی بھی قسم کی حقارت کا اظہار کرنا سخت ناپسند تھا۔ سر سید کے خط کا یہ حصہ ملاحظہ کیجیے جس میں ان کی علم و مرتبے کے غرور کے بارے میں رویے کی وضاحت ہوتی ہے۔ سید راس مسعود (۱۸۸۹-۱۹۳۷) نے خطوط کو مرتب کرتے ہوئے مذکورہ شخص کے نام کو حذف کر دیا ہے تاکہ کوئی بدمزگی پیدا نہ ہو۔ سر سید کے مطابق حقیقی تصوف کے کیا معنی ہیں اور وہ کس قسم کے لوگوں کو ناپسند کرتے ہیں، اس کی وضاحت کرتا ہوا سر سید کا یہ خط بذاتِ خود ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

> ”میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے برادر شفیق جناب حاجی مولوی شاہ ع۔ ا، عرف اج برادر بزرگ مولوی س۔۔۔خ کو مجھ سے کیا رنج پہنچا ہے۔ شاید یہ رنج ہو کہ میں نے ان کے چھوٹے بھائی سے برادرانہ محبت کی تھی یا یہ سبب ہے کہ انھوں نے حج کر لیا، ششماہی کے روزے رکھ لیے، شاہ عبدالغنی صاحب کے مرید ہو کر خلیفہ ہو گئے۔ ان کے نمازوں، روزوں اور حج اور زہد و تقویٰ کا خدا پر اتنا احسان ہوا کہ بار احسان سے خدا کی پشت دو تا ہو گئی، اس نے عشرہ مبشرہ میں ایک عدد زیادہ کر دیا مگر میں ایسے خدا کو جس پر لوگ اس کی عبادت کا احسان کریں اور اس کی پیٹھ احسان کے بوجھ سے خم ہو جاوے، ایک کوڑی کو بھی نہیں خرید تا۔ مولوی س۔۔۔خ اپنے بھائی کی محبت نہ توڑیں گے میں میری محبت توڑنی منظور کی۔ پس وہ نازک شیشہ کیوں کر قائم رہ سکتا ہے۔ خیر خدا ان کو اور ہم کو سب کو معاف کرے۔“(۱۹)

مسلمانوں میں اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے درمیان ” فلسفہ تقلید“ پر خاصی علمی تکرار ہو چکی ہے۔ بہت سے لوگ تقلید کو اپنے لیے ضروری خیال کرتے ہیں اور آئمہ کرام کی تقلید کو اپنے لیے مشعل راہ سمجھتے ہیں جب کہ بہت سے لوگ عقل و منطق کی روشنی ہی کو رہنما تصور کرتے ہیں اور تقلید کو اتنا زیادہ ضروری خیال نہیں کرتے۔ یہ دونوں نظریات چوں کہ ایک دوسرے سے مختلف اور کسی حد تک منفرد ہیں اس لیے کسی شخص کا کسی ایک نظریے پر چلنا بعید از امکان نہیں ہے۔ سر سید احمد خان (۱۸۱۷-۱۸۹۸) کو ان لوگوں میں سے تھے جو اپنا جہاں خود پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ان کی زندگی علم و جستجو سے عبارت تھی اور اسی لیے وہ ہر شے کو تجسس اور تحقیق کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور نتائج بر آمد کرتے تھے۔ یہ نتائج کہیں عین درست ہوتے تھے اور کہیں بہت سے لوگوں کے لیے ناقابلِ قبول۔ اسی لیے انھیں اس حوالے سے تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔ برصغیر میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد تقلید پرستی کی جانب مائل تھی اور یہ تقلید اگر آئمہ تک رہتی تو کوئی مسئلہ نہ تھا جب جھوٹے پیر اور فراڈیے عالمِ اسلام کی جڑیں کھوکھلی کرنے پر پر تولنے لگے تو اس نے سر سید احمد خان دلی رنج پہنچایا۔ اگر سبھی مسلمانوں کا رویہ اسلام کے حوالے علم و جستجو کا رہے تو وہ بہت جلد کفر و گمراہی سے نکل سکتے ہیں:

> ”بھائی جان سنو اب یہ وقت نہیں رہا کہ میں اپنی مکتوبات ضمیر کو مخفی رکھوں۔ میں صاف کہتا ہوں کہ اگر لوگ تقلید نہ چھوڑیں گے اور خاص اس روشنی کو جو قرآن و حدیث صحیح

سے حاصل ہوتی ہے نہ تلاش کریں گے اور حال کے علوم سے مذہب کا مقابلہ نہ کریں گے تو مذہب اسلام ہندوستان سے معدوم ہو جائے گا۔ اسی خیر خواہی نے مجھ کو برانگیختہ کیا ہے جو میں ہر قسم کی تحقیقات کرتا ہوں اور تقلید کی پرواہ نہیں کرتا۔ ورنہ آپ کو خوب معلوم ہے کہ میرے نزدیک مسلمان رہنے کے لیے اور بہشت میں داخل ہونے کے لیے آئمہ کبار تو درکنار مولوی صاحبو کی بھی تقلید کافی ہے۔ لا الہ الا اللہ و محمد رسول اللہ کہہ لینا ہی ایک ایسی طہارت ہے کہ کوئی نجاست باقی نہیں رہتی۔ پس میں چاہتا ہوں کہ یہ دلائل ومباحثہ مجھ کو قائل کر دیا جائے کہ میر یہ رائے صحیح ہے یا غلط اور میں دشمن اسلام ہوں یا مثل ابو بکرؓ و عمرؓ کے دوست اسلام ہوں۔"(۲۰)

سر سید احمد خان (۱۸۱۷-۱۸۹۸) اپنی قوم کے ان لوگوں سے سخت نالاں دکھائی دیتے تھے جو ان کے خیال میں وقت کے چلن، یورپ کی چکا چوند تہذیب، بدلتے فکری زاویوں وغیرہ سے ناواقف تھے یا دین میں جدید نقطہ نگاہ سے سوچنے، سمجھنے کو برا جانتے تھے۔ انھوں نے اسی لیے اس حوالے سے جو نہایت مشقت سے کتاب تحریر کی تھی۔ یہاں ایک اور اہم معاملہ یہ بھی درپیش رہتا ہے کہ جب کہ سر سید احمد خان ایسی کتاب جو کہ برصغیر کے رہنے والے قدامت پسند مسلمان پڑھنا ہی نہیں چاہتے تھے، لکھنے پر اور اس پر اتنی محنت کرنے پر کیوں مصر تھے؟ اس کا جواب ان کا قوم سے خلوص اور اخلاق کا رشتہ ہی ہو سکتا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ لوگ نہیں تو ان میں سے کچھ لوگ ہی صحیح رستے پر آجائیں خواہ انھیں کتنی بھی قربانیاں دینی پڑیں۔ وہ سخت مسائل کے باوجود اپنیقوم کی فکر میں مبتلا تھے اور اس کی بقا کے لیے سر توڑ کوشش کر رہے تھے۔ ان کے اس خط کو ملاحظہ کیجیے جس میں وہ قوم کی جانب سے مایوسی کا شکار نظر آتے ہیں لیکن ان کی اخلاقیات پھر بھی انھیں کام کرنے سے نہیں روک پاتی۔

"جلد اول میری کتاب کی بالکل جواب ہے۔ ان کی پہلی جلد کا اور اور مصنفوں کا جنھوں نے اس قدر مضمون پر لکھا ہے۔ میرے ہم قوم اس محنت کی جو میں نے اس کتاب کی تصنیف میں کی ہے قدر نہیں کریں گے بلکہ نہایت الزام دیں گے اور کافر بتلائیں گے۔ کیوں کہ میں پابند تقلید نہیں رہا ہوں اور شاید دو تین مسئلوں میں جمہور سے اختلاف کیا ہے اور چند علما کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔ پس ہمارے شفیق تمام چیز کو چھوڑ کر انھی مسئلوں کی بدولت فتویٰ کفر دیں گے۔"(۲۱)

سر سید احمد خان(۱۸۱۷-۱۸۹۸) کے خطوط میں جہاں ایک جانب اپنی قوم کی محبت ٹھاٹیں مارتی نظر آتی ہے وہیں وہ اس بات پر متفکر بھی نظر آت ہے وہیں وہ انگریزوں کے اچھے کاموں کی خوب تعریف بھی کرتے ہیں۔ سر سید کی اخلاقیات میں یہ بات شامل رہی ہے کہ وہ اچھے کو اچھا اور برے کو برا کہیں ۔ جہاں کہیں انھیں ولیم میور(۱۸۱۹۔۱۹۰۵) جیسے شخص کی کتب میں خرابی نظر آئی انھوں نے اس کے خلاف جہاد کیا لیکن جہاں انگریز کا اچھا سلوک، رواداری اور محبت کی کوئی مثال ملی ، انھوں نے وہ بھی اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ اشتراک کی تاکہ اخلاقیات کا سفر رکنے نہ پائے۔ اسی لیے ان کے تمام فلسفوں پر اخلاقیات کا فلسفہ ہی غالب(۱۷۹۷-۱۸۶۹) نظر آتا ہے۔ مثلاً لفظ ''فارقلیط'' جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کو اسی نام کے تحت توریت میں بیان کیا گیا ہے اور ان کی بشارت دی گئی ہے، سر سید احمد خان(۱۸۱۷-۱۸۹۸) اس کی تحقیق کے سلسلے میں انگریز مصنف کو داد دیتے ہوئے مسلمان علما کو ایسی نئی اور جامع تحقیق کی دعوت دیتے ہیں۔ یہاں ان کا فلسفہ اخلاق قومیت سے بڑھ کر اجتماعیت اور آفاقیت کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔ اس حوالے سے نواب محسن الملک(۱۸۳۷-۱۹۰۷) کو ایک خط میں تحریر کرتے ہیں کہ اس سب کے باوجود لوگ خود انھیں دین دشمن سمجھتے ہیں تو سمجھیں، وہ اسلام اور قوم کی خدمت جاری رکھیں گے۔ ملاحظہ کیجیے:

''وہی مشہور لفظ ''فارقلیط'' کا ہے۔ مگر جس طرح پر کہ اس کو مسٹر ہگنز نے ثابت کیا ہے اس کو پڑھ کر مسلمان متعصب مولویوں کو غیرت کرنی چاہیے کہ جو کام ان کے کرنے کا تھا اس کو ایک غیر مذہب کے منصف شخص نے کیا ہے۔ میں نے اس میں کچھ اضافہ نہیں کیا۔ بعینہٖ مسٹر ہگینز کی تحریر نقل کر دی ہے۔ مگر ایک اور عمدہ بات میں نے یہ ثابت کی ہے کہ نام آن حضرت کا ''محمد'' توریت میں موجود ہے۔ چنانچہ عبری توریت میں وہ لفظ اور نشان شمائل آں حضرت کے بجنسہ نکالے ہیں مگر افسوس ہے کہ اس پر بھی میں کافر ہوں اور یاران باد فروش وعظ گو مسلمان۔ کیا انھوں نے خدا کو بھی اپنا ہی سانابینا یقین کیا ہے۔''(۲۲)

جہاں سر سید احمد خان(۱۸۱۷-۱۸۹۸) کے خطوط پند و نصائح سے بوجھل ہونے لگتے ہیں وہاں ان کی خطوط اخلاقیات کے دائرے میں رہتے ہوئے ہی شوخی، ظرافت، مہر و محبت کے رنگ بھی بکھیرتے ہیں۔ یہ انسانی نفسیات ہے کہ کوئی بھی شخص ہمیشہ کسی ایک ہی ذہنی کیفیت میں مبتلا نہیں رہ سکتا۔ تغیر انسانی زندگی کا خاصا ہے اور

حسن بھی۔ سر سید بھی ایک ایسے انسان تھے جنھیں قوم کی بہتری کی فکر کھائی جاتی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے خطوط میں ظرافت بھی ملتی تھی. مولوی عبد الحق (۱۸۷۱۔۱۹۶۱) اپنی کتاب ”سر سید احمد خاں۔ حالات و افکار“ میں اس کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”زندہ دلی اُن کی فطرت میں تھی، اگرچہ عمر کے ساتھ ساتھ کام کی کثرت روز بروز بڑھتی جاتی تھی اور نئے نئے حالات و واقعات ان پر ہجوم کی طرح ٹوٹ پڑے تھے لیکن ان کی زندہ دلی میں فرق نہ آیا۔ وہ اپنے بعض ہم عمر بے تکلف دوستوں سے بڑی دل لگی اور شوخی کی باتیں کرتے تھے۔“(۲۳)

سر سید کی تحاریر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تعصب اور بغض و عناد سے دور رہتے تھے اور دوسروں کو بھی اس سے دور رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ ان کی ساری زندگی مخالفت ہوئی، ان پر فقرے کسے گئے، اودھ پنچ نے ان پر طنز کے تیر برسائے، اکبر الہ آبادی جیسے بڑے شاعر ان کے خلاف صف آرا رہے لیکن ان کے پائے لغزش میں کوئی لڑکھڑاہٹ نہ آئی اور نا ہی انھوں نے اخلاقیات کا دامن چھوڑا۔ ان ان کا رویہ معذرت خواہانہ اور عاجزانہ ہی رہا۔ ان کے بارے میں سید راس مسعود کہتے ہیں کہ وہ بہت سی خوبیوں سے مزین انسان تھے اور خوش اخلاقی میں پیش پیش رہتے تھے۔ وہ اپنے معاصرین میں ممتاز ہونے کے باوجود ان سے اور اسلاف سے محبت و خلوص کا رشتہ ہمیشہ قائم رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اسلاف سے اس طرح کہ ان کے ذکر پر ان کی آنکھیں نم ہوتیں اور ان کی سیرت ان کے لیے عمل گاہ ہوتی۔ سید راس مسعود (۱۸۸۹۔۱۹۳۷) اس حوالے سے تحریر کرتے ہیں کہ:

”سر سید اعظم کے دل میں باوجود جوش آزادی اور جدت رائے کے، اکابرین سلف اور ان کے کارناموں کی جو عظمت تھی اس کی مثال ہم کو اپنے زمانہ میں اور کہیں نہیں ملی۔ گزشتہ زمانے کے جو جو اکابرین گزرے ہیں ان کے اور ان کے ہر قسم کے کاناموں کی عزت بلا امتیاز قومیت و مذہب سر سید اعظمؒ کے پاک دل میں ایسی ہی جاگزیں تھی جیسے نگین میں نام۔ خود ہم نے بہت دفعہ سر سید کو دیکھا ہے کہ جب کبھی ان کے زمانہ کے ذی کمال، ذی وقار بزرگوں کا ذکر ان کی مجلس میں آتا تھا تو وہ ان کی یاد سے ایسے متاثر ہو جاتے تھے کہ اکثر ان کے آنسو جاری ہو جاتے تھے اور صاف دکھائی دیا کرتا تھا کہ باوجود سعی کے ضبط کا دامن ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا ہے“(۲۴)

سر سید احمد خان (۱۸۱۷-۱۸۹۸) کی خط و کتابت ''شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد (۱۸۳۲۔۱۹۱۰) کے ساتھ بھی جاری رہی ہے۔ سر سید احمد خان کو بہت سے لوگ انگریز کا ایجنٹ بھی کہتے رہے ہیں لیکن ان کے خطوط سے ان لوگوں کے نظریات کی نفی ہو جاتی ہے۔ جہاں کہیں بھی مسلمانوں کے خلاف نا انصافی پر مشتمل گفتگو کی جاتی، سر سید زبانی و تحریری ہر طرح سے اس کا جواب دینے کے لیے ہمہ وقت تیار ملتے۔ ان کا ایک ایسا ہی خط محمد حسین آزاد کے نام ہے جس میں ان کے اس دعوے کو رد کرتے ہیں کہ قرآنِ مجید کا معجزہ محض فصاحت ہی ہے اس کی علمیت نہیں یا بالفاظِ دیگر یہ علمیت کے بجائے محض فصاحت آمیز کتاب ہے۔ اچھی دوستی کے باوجود، جہاں سر سید کو ان کی بات بری، خلافِ عقل و منطق یا نا انصافی پر مشتمل معلوم ہوتی ہے، وہ بلا تاخیر ان کی ناراضی کی پروا کیے بنا اس کا موثر جواب یوں دیتے ہیں :

''اس بات کے کہنے سے مجھے معاف کیجیے کہ یہ آپ کا خیال ہے کہ ''قرآن میں کوئی مضمون علمی نہیں خالص فصاحت اس کا معجزہ ہے'' درست نہیں ہے۔ قرآن علم و نیچر اور فصاحت سب سے معمور ہے اور مجموع من حیث المجموع معجزہ ہے۔''(۲۵)

سر سید احمد خان (۱۸۱۷-۱۸۹۸) اولاد کی تربیت کے حوالے سے بہت محتاط تھے اور اپنے دوستوں سے بھی خطوط میں اس حوالے سے مشورہ دیتے نظر آتے ہیں۔ حقیقت میں ہر بچہ اہمیت کا حامل اور نایاب ہوتا ہے۔ بچہ کل کا بڑا اور قوم کا معمار ہے اور اگر خود اس معمار کی تربیت ہی درست زاویے پر نہ کی جائے تو معاشرے کی بنیاد مضبوط نہیں ہو سکتی۔ فلاحی اور مثالی معاشروں کے قیام میں والدین کی اخلاقی تربیت نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ سر سید احمد خان اپنے بیٹوں جیسے محمد احمد کے حوالے سے نواب محسن الملک (۱۸۳۷-۱۹۰۷) سے خطوط میں خاصے متفکر نظر آتے ہیں ۔ ان کے نزدیک ہر بچے پر بڑے کا احترام لازم ہے۔ جب کہ بڑے بچوں کو محبت اور پیار دے رہے ہوں، ان کا مکمل خیال رکھ رہے ہوں اور ان کی تربیت میں اپنی جانب سے کوئی کوتاہی نہ کر رہے ہوں تو ایسے میں بچوں کو بھی چاہیے کہ وہ بھی اسی خلوص اور محبت کا اظہار کریں۔ جب کہ وہ اس کے لیے نہایت نیک جذبات رکھتے ہیں، اس کی اور مجموعی طور پر سبھی بچوں کی تربیت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ :

''آپ نے لکھا ہے کہ جس زمانہ میں اس کی تعلیم خطرہ کی حالت میں تھی'' اس کی تعلیم ہمیشہ خطرہ کی حالت میں ہے۔ اب اس کی طبیعت کسی کی بات سننے یا اس پر عمل کرنے کے لائق نہیں رہی ہے۔ وہ خود بھی ماشاءاللہ جوان ہو گیا ہے۔ اب اس کی تعلیم خود اس کی

مرضی پر منحصر ہے۔ اس کا دل چاہے گا پڑھے گا اور پڑھنے پر محنت کرے گا۔ چاہے گا نہ کرے گا بلکہ شاید تاکید یا تنبیہ مضر ہو گی اور اس کی طبیعت میں ضد پیدا ہو گئی ہے۔ پس بہتر ہے کہ اس کی مرضی پر چھوڑا دیا جائے ۔ جتنا چاہے کرے ، جتنا چاہے نہ کرے۔"(۲۶)

خوشی اور غم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں ہی حقیقت میں محض انسانی نفسیات سے تعلق رکھتے ہیں اور خارج میں ان کا وجود ایک واہمہ ہے۔ ایک شخص خوش ہو تو اسے ساری دنیا حسین اور خوبصورت محسوس ہوتی ہے اور ایک شخص غم زدہ ہو تو اسے سہانی رت بھی غم میں ملفوف دکھائی دیتی ہے۔ سر سید احمد بھی اسی فلسفے کے حامی ہیں۔ ان کے نزدیک افسردگی اگر اندر ڈیرے ڈال چکی ہے تو کوئی شہر ہو، کوئی گاؤں ہو یا کوئی بھی مقام ہو، اس کے دل کو کہیں قرار نہیں ملے گا۔ دوسری جانب اگر انسان اندر سے خوش ہے تو اس کے اندر پہاڑ توڑ ڈالنے کا جذبہ جنم لے لیتا ہے۔ خط میں اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہ انسان اپنی مرضی کے خلاف بہت کم باتوں کو برداشت کرتا ہے جب کہ حسبِ منشا باتوں پر نہایت مسرور ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ یہ سب بشریت کا تقاضا ہے اور اس کے سوا کچھ بھی نہیں اس لیے عارضی خوشی اور غم کا ملال کیسا۔ ان کی دل جوئی اور ہمدردی کے ساتھ تحریر کرتے ہیں کہ ان عارضی نفسیاتی مسائل سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ نیکی کی راہ پر مضبوطی سے کاربند رہا جائے۔

سر سید احمد خاں بھی باقی لوگوں کی طرح خوشی و غم میں برار شریک ہوتے تھے۔ آپ لوگوں کی عیادت کے لئے بھی جاتے ہیں اور دکھ درد میں بھی برابر شریک ہوتے تھے۔ آپ کے عزیز نے آپ کو خط لکھا اور اس میں ہمشیرہ کی بیماری کے بارے میں بتایا۔ آپ نے جواباً خط میں لکھا:

"تمہارا خط پہنچا۔ ہمشیرہ کی علالت طبع جو حد سے زیادہ ہو گئی ہے۔ اس کا مجھ کو نہایت رنج ہے۔ میں ہر چند دل کو دہلی آنے پر مضبوط کرتا ہوں۔ مگر وہاں کے مکانات اور سید حامد مرحوم کا رنج اس قدر دل پر اثر کرتا ہے کہ قدم نہیں اٹھتا۔ اب تک سید حامد مرحوم کا غم میرے دل سے کم نہیں ہوا۔ یہاں اور کاموں کے خیال میں دن گزر جاتا ہے۔ مگر دہلی کے خیال سے غم تازہ ہو جاتا ہے۔"(۲۷)

سر سید احمد خان (۱۸۱۷-۱۸۹۸) کے خطوط اور ان کی زندگی کے بارے میں مطالعہ کرنے سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ سر سید احمد خان سچے پکے مسلمان تھے آپ کا اللہ تعالیٰ اور نبی آخر زماں ﷺ پر پختہ ایمان

تھا۔ آپ کو مسلمانوں سے گہری محبت اور لگن تھی۔ آپ حق بات کہنے کے عادی تھے، اور حق بات کہنے مین اپنا نفع نقصان نہیں دیکھتے تھے اور نہ ہی اس میں مذہب کو آڑھے آنے دیتے، بلکہ انگریز جو کہ ہندوستان پہ غاصب تھے اور مسلمانوں کے دشمن تھے اس کے باوجود بھی اگر کوئی انگریز سچی بات کرتا تو آپ ان کی تعریف بھی کرتے تھے۔ اگر آپ کو سر ولیم میور (۱۸۱۹-۱۹۰۵) کی کتابوں میں خرابی نظر آئی تو آپ نے بلاخوف وخطر اس کے خلاف جہاد کیا۔ اور جہاں مسٹر ہگنز کی تحقیق میں حضور ﷺ کے بارے میں اچھے الفاظ ملے، آپ نے انکی بہت تعریف کی اور انہیں داد بھی دی۔ اور مسلمانوں اور خاص طور پر علماء اکرام کو ان سے سیکھ کر تحقیق کرنے کی تاکید کی۔ آپ کے خطوط میں پیار محبت زمان ومکاں اور اخلاقی اسباق اور فلسفیانہ باتیں پائی جاتی ہیں۔ آپ Orthodox نہیں تھے بلکہ جدیدیت کو پسند کرتے تھے۔ آپ نے مسلمان والدین کو تربیت اطفال کے بارے میں سختی سے تاکید کی۔ تربیت اطفال میں غفلت کو معاشرتی نقصان کا باعث سمجھا جس سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ انکا فلسفہ اخلاق قومیت سے بڑھ کر اجتماعیت اور آفاقیت کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عتیق احمد صدیقی، مرتب، سرسید: بازیافت، علی گڑھ: سرسید اکادمی، علی گڑھ یونی ورسٹی، ۱۹۹۰ء، ص:۴۱

۲۔ صغیر افراہیم، پروفیسر، مکتوباتِ سرسید کا معروضی تجزیہ مضمون، مشمولہ: فکر و نظر، سہ ماہی، جلد ۵۴، شمارہ نمبر ۱، علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، مارچ ۲۰۱۷ء ص:۳۴۵

۳۔ سید راس مسعود، مرتب، خطوطِ سرسید احمد خان، بدایوں: نظامی پریس، ۱۹۲۴ء، ص:۲۹

۴۔ ایضاً، ص:۲۹

۵۔ سید راس مسعود، مرتب، خطوطِ سرسید احمد خان، ۱۹۲۴ء، ص:۳۵

۶۔ ایضاً، ص:۴۰

۷۔ ایضاً، ص:۴۲

۸۔ ایضاً، ص:۴۴

۹۔ ایضاً، ص:۴۹

۱۰۔ مشتاق حسین، مکاتیب سرسید احمد خاں، فرینڈس بک ہاؤس: یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ، س ن، ص ۴۶

۱۱۔ سید راس مسعود، مرتب، خطوطِ سرسید احمد خان، ۱۹۲۴ء، ص:۳۵

۱۲۔ ایضاً، ص:۵۴

۱۳۔ ایضاً، ص:۵۴

۱۴۔ مترجم سید ابوالحسنات، میر نجابت علی، ترقی اردو بورڈ: ایسٹ بلاک نمبر ۷، آر۔ کے پورم وزارت تعلیم و سماجی بھلائی، نئی دہلی، س ن

۱۵۔ سید راس مسعود، مرتب، خطوطِ سرسید احمد خان، ۱۹۲۴ء، ص:۶۲
۱۶۔ ایضاً، ص:۷۱
۱۷۔ ایضاً، ص:۶۳
۱۸۔ ایضاً، ص:۶۳
۱۹۔ ایضاً، ص:۶۴
۲۰۔ ایضاً، ص:۶۷
۲۱۔ ایضاً، ص:۷۱
۲۲۔ ایضاً، ص:۸۹
۲۳۔ عبدالحق، مولوی، سرسید احمد خاں۔ حالات وافکار، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۵۹ء، ص ۴
۲۴۔ سید راس مسعود، مرتب، خطوطِ سرسید احمد خان، ۱۹۲۴ء، ص:۱۲
۲۵۔ ایضاً، ص:۲۲
۲۶۔ ایضاً، ص:۸۴
۲۷۔ محمد اسماعیل، شیخ، پانی پتی، مکتوبات سرسید، مجلس ترقی ادب: کلب روڈ لاہور، ۱۹۷۶ء، ج ا ص ۲۴

References in Roman Script

1. Atiq Ahmed Siddiqui, Mratab, SirSyed: Bazyaft, Ali Garh: Sir syed Academy, Aligarh University, 1990. Page 41
2. Saghir Ifrahim, Professor, Maktoobat e Sirsyed ka Maroozi Tajzia Mazmoon Mashmoola Fikro Nazar, She Mahi Mujalla jild 54 shumara 1, Aligarh, Aligarh Muslim University, March 2017, Page345
3. Syed Ras MAsood, Muratab, Khatoot e Sirsyed Ahmed Khan, Bdaieo: Nizami Press, 1924, Page 29
4. Ibid, Page 29
5. Syed Ras Masood, Muratab, Khatoot e Sirsyed Ahmed Khan, 1924, Page 35
6. Ibid, Page,40
7. Ibid, Page, 42
8. Ibid, Page, 44
9. Ibid, Page, 49

10. Mushtaq Hussain, Makateeb Sirsyed Ahmd Khan, Friends Books House, University Market Aligarh, S.N, Page 46
11. Syed Ras MAsood, Muratab Khatoot e Sirsyed Ahmed Khan, 1924, Page 35
12. Ibid, Page, 54
13. Ibid, Page, 54
14. Mutarajum Syed Abu ul Hasnat, Meer NajatAli, Taraqi Urdu Board, East Block Number 7, R K Porm Wizarat Taleem wa Samaji Bhalai,New Delhi, S.N
15. Syed Ras, Masood, Muratab, Khatoot e Sirsyed Ahmed Khan, 1924, Page 62
16. Ibid, Page, 71
17. Ibid, Page, 63
18. Ibid, Page,63
19. Ibid, Page64
20. Ibid, Page 67
21. Ibid, Page71
22. Ibid, Page, 89
23. Abdulhaq Molvi, Sirsyed Ahmed Khan, Halat o Ifkar, AnjumanTaraqi Urdu Pakistan, 1959, Page 4
24. Syed Ras MAsood, Muratab, Khatoot Sirsyed Ahmed Khan, 1924, Page 12
25. Ibid, Page,22
26. Ibid, Page, 84
27. Muhammad Ismail, Sheikh, Pani Pati, Maktoobat Sirsyed, Majlis Taraqi Adab, Club Road, Lahore, 1976, J 1, Page 24